محمد طفیل
اِدارۂ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد

پاکستان اور سیکولر نظامِ تعلیم

ریاست ایک ایسی اکائی ہے جس میں تعلیم نہایت اہم جزو کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ ریاست جن نظریات، نصب العین اور خصوصیات کی حامل ہوگی تعلیم یقیناً ان نظریات، نصب العین اور نمایاں قدروں کو اپنا کر اپنا لازمی حصّہ بنالے گی اور ان امُور کا مظہر بن جائے گی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ تعلیم پُورے ریاستی نظام کے تابع ہوتی ہے۔ اور دوسرا سبب یہ ہے کہ نظامِ تعلیم مرتب کرنے والے وہی افراد ہوتے ہیں جو ایک جانب تو ریاست کے نظریات پر مکمل یقین رکھتے ہوں تو دوسری جانب ان کی ژرف نگاہی یہ جان رہی ہو کہ اپنے سماجی، تمدّنی اور جغرافیائی حالات کے پیشِ نظر وہ نئی نسل کو کن خطوط پر چلانا چاہتے ہیں۔ پھر ماہرینِ تعلیم، نظامِ تعلیم اور نصابِ تعلیم مرتب کرتے وقت اِس امر کو بھی نظرانداز نہیں کرتے کہ ان کی نئی نسلیں، نوزائیدہ و ترقی پذیر اذہان اپنے ماضی سے نہ کٹ جائیں، اسی لیے وہ عام حالات میں ماضی کی قدریں سامنے رکھ کر ہی مستقبل کا نقشہ تیار کرتے ہیں۔

ضروریاتِ زندگی اور مخصوص حالات کے پیشِ نظر جب یہ لازمی ہُوا کہ نظامِ تعلیم ریاستی نظام سے روشنی مستعار لے تو ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک نظر مختلف نظامہائے حکومت پر بھی ڈال لیں اِس وقت عام طور پر تین طرح کے نظامِ ریاست رائج ہیں۔ جمہوری نظامِ حکومت، غیر مذہبی نظام اور مذہبی طرزِ حکومت، ان تینوں میں ایسا بُعدالمشرقین ہے کہ ابھی تک کوئی ایسی شکل پیدا نہیں ہوسکی کہ انہیں کسی ایک نقطہ پر جمع کیا جاسکے۔ یہی وجہ ہے کہ ان نظاموں میں طرزِ تعلیم بھی ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہے۔ ہم اِس مختصر سے مقالہ میں ان تینوں نظاموں کا تفصیلی جائزہ تو نہیں لے سکتے البتہ ہم اس امر پر بحث کریں گے کہ مختلف تعلیمی نظاموں میں مذہب کا کس حد تک عمل دخل ہے۔ سطورِ بالا میں مذکور پہلا اور تیسرا نظامِ تعلیم ـــ جمہوری اور نظریاتی ـــ اس حد تک متفق دکھائی دیتے ہیں کہ ریاست میں مذہب کا وجود ہونا چاہیے۔ چنانچہ جمہوری ممالک میں بھی مذہب کو تعلیم کا جزو سمجھا جاتا ہے۔ BERTRAND RUSSELL

نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب تعلیم اور نظامِ معاشرہ (EDUCATION & SOCIAL ORDER) میں لکھا ہے:

"انگلستان میں تمام پبلک نیز تمام ابتدائی مدارس یا تو کلیسائے انگلستان سے تعلق رکھتے ہیں یا رومن کیتھولک فرقے سے"۔ رسل نے اسی کتاب میں ایک اور جگہ لکھا ہے کہ مغربی ممالک میں مذہب نظامِ تعلیم کا جزو ہے، لیکن اس سے ہر بچہ متاثر نہیں ہوتا۔ ان کی رائے میں اہلِ ثروت اپنے بچوں کو مذہبی تعلیم دلوانا پسند کرتے ہیں اور دلواتے ہیں لیکن غریب بچے جس نظامِ تعلیم کے تحت پنپتے ہیں اس میں مذہبی تعلیم کم ہوتی ہے۔ جمہوری ملکوں کی طرح مذہبی نظریہ پر قائم ہونے والے ممالک ـــ پاکستان اور اسرائیل ـــ میں مذہب جزوِ تعلیم ہونا ایک ضروری اور لازمی امر ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہ ریاستیں اپنا تشخص قائم نہ رکھ سکیں گی، اور جلد یا بدیر یہ ریاستیں بھی جمہوری یا غیر مذہبی (SECULAR) نظام کا جزو بن جائیں گی۔

جہاں تک تیسرے نظام کا تعلق ہے جسے غیر مذہبی (SECULAR) کہا جاتا ہے جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، اس میں مذہب کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ نظام نہ صرف اپنے ہاں سے مذہب کو خارج کر کے غیر جانبدار کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔ بلکہ اپنی قوتوں کو مذہب کے خلاف استعمال کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتا ہے۔ چنانچہ دائرہ معارف سماجی علوم (ENCYCLOPAEDIA OF SOCIAL SCIENCES) کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

"THE DISTINCTION DRAWN UP BY THE SCHOLARS BETWEEN FAITH AND KNOWLEDGE, WHILE IT LEFT NO ROOM FOR REVEALED THEOLOGY"

جبکہ "دائرہ معارفِ اخلاقیات و مذہبیات" میں لکھا ہے کہ "غیر مذہبی نظریہ ایک ایسی تحریک ہے جسے اخلاقی کہا جاتا ہے لیکن وہ مذہبیات کے سخت خلاف ہے"۔ اگرچہ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ کیا دنیا میں کوئی ایسا مذہب بھی پایا جاتا ہے کہ جس میں اخلاقیات کی تعلیم نہ دی جاتی ہو۔ چنانچہ یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ دنیا کے تمام آسمانی اور غیر آسمانی مذاہب میں اخلاقیات کا عنصر شامل ہے۔ اگر مذکورۂ بالا مقالہ نگار کی رائے کو تسلیم کر لیا جائے تو مذہب کا ایک پہلو ـــ اخلاقیات ـــ غیر مذہبی نظام میں شامل ہے۔

غیر مذہبی نظام کی وضاحت کرتے ہوئے برطانوی دائرہ معارف (ENCYCLOPAEDIA OF BRITANICA) کا مقالہ نگار رقم طراز ہے کہ 'سیکولر' کا واضح مدعا مذہب یا کلیسائی نظام کو ریاست

اور اس کے سیاسی ڈھانچہ سے الگ کرنا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں:

"SECULARISM IS A TERM APPLIED IN GENERAL TO THE SEPARATION OR ALIENATION FROM SPIRITUAL OF STATE POLITICS OR ADMINISTRATION FROM RELIGIOUS OR CHURCH MATTERS,,

بہر حال مذکورۂ بالا سب مقالہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ سیکولر نظامِ ریاست میں مذہب یا مذہبی اُمور کی کوئی گنجائش باقی نہیں ہے۔ اِس لیے کسی بھی ایسے ملک کا تعلیمی ڈھانچہ مذہبی نہیں ہو سکتا جو سیکولر نظامِ حکومت رکھتا ہو۔ اسی نظریہ کی تائید کرتے ہوئے غیر مذہبی تعلیمی ڈھانچہ کی وضاحت کرتے ہوئے برطانوی دائرۂ معارف کے مقالہ نگار نے لکھا ہے:

"SECULAR EDUCATION IS A SYSTEM OF TRAINING FROM WHICH DEFINITE RELIGIOUS TEACHINGS IS EXCLUDED,,

مذکورۂ بالا سطور میں ہم نے صرف یہ پیش کیا کہ سیکولر نظامِ حکومت کے نتیجہ میں سیکولر تعلیمی ڈھانچہ ہی وجود میں آتا ہے۔ لیکن اب تو جمہوری اور مذہبی ممالک میں بھی یہ رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے کہ مذہب ایک فرسودہ چیز ہے۔ یہ رجعت پسندوں کی ایجاد ہے۔ اور مذہب نوعِ انسانی کی ترقی میں حائل ہے۔ کیونکہ مذہب پسند طبقوں میں قناعت کا کچھ ایسا تصور پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ ترقی کی جانب متوجہ ہی نہیں ہوتے۔ اِس لیے اب ہمارے نظامِ حیات میں مذہب کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ بلکہ زیادہ "روشن خیال" طبقوں نے یہ نعرہ زور شور سے بلند کرنا شروع کر دیا کہ مذہب انسان کا انفرادی اور نجی معاملہ ہے۔ جس کے لیے ہر شخص کو مکمل آزادی حاصل ہے۔ ریاست کسی گروہ یا سیاسی جماعت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی بھی شخص کے ذاتی اور انفرادی معاملات میں دخل انداز ہو۔ جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا کہ تعلیم ریاستی نظام کا جزو لاینفک ہے تو جب ریاست سے فرد کا تعلق ہی چند اُمور میں رہا، جن میں مذہب یقیناً شامل نہیں ہے تو نظام بھی ایسا ہی ہونا چاہیے جو سیکولر ہو۔ اور اس میں مذہب کو قطعاً دخل نہ ہو۔

انیسویں صدی کے آخر سے انسان نے مذہب سے کھلم کھلا بیزاری سے کا اعلان شروع کر دیا۔ اور بیسویں صدی میں تو یہ فقرہ کہ "مذہب ایک افیون ہے" ایک ایسا فیشن بن گیا کہ اشتراکی اور شیوعی (COMMUNIST) ممالک میں تو لوگ مذہب کو ملک بدر کر ہی رہے تھے، افسوسناک امر تو یہ ہے

کہ جمہوری ممالک میں بھی مذہب کو خیرباد کہنے کا رجحان عام ہوگیا۔ اس وقت دنیا کی تہذیب و ثقافت اور تمدن و سیاست اشتراکی اور جمہوری یا سرمایہ دارانہ نظام سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس لیے جب ان ممالک میں مذہب کے خلاف بہت سے عناصر اُبھرے، اور بعض لوگ تو ایسے سر پھرے نکلے کہ انہوں نے زمان و مکان کا سہارا لیکر مذہب کا انکار کر دیا، تو دنیا کی دیگر آبادی بھی ان غیر مذہبی نظریات سے متاثر ہوئی۔

پاکستان ایک خالصتہً نظریاتی مملکت ہے۔ اور نظریاتی بھی ایسی کہ جس میں اللہ کا پسندیدہ دین اسلام بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ملک میں اگرچہ مروجہ قوانین کو اسلامی نہیں کہا جا سکتا پھر بھی اس کے انتظامی ڈھانچہ پر اسلام کی گہری چھاپ ضرور موجود ہے۔ یورپ و امریکہ اور روس و چین کی غیر مذہبی اور خلافِ مذہب فضا سے پاکستان بھی بحیثیتِ ملّت متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اور بعض سرکردہ سیاست دانوں نے اس ریاست کو سیکولر نظام کے چنگل میں پھنسانے کی ہر ممکن کوشش کی۔

جب پاکستان ان حالات سے گزر رہا ہے کہ اسے مذہبی مملکت کی حیثیت سے زندہ رہنا اور اپنا تشخص برقرار رکھنا چاہیے یا اپنی اساس و نظریات کو بدل کر اپنے کو غیر مذہبی ریاست (SECULAR STATE) کی شکل دیکر اشتراکیت، شیوعیت یا مغربیت میں جذب ہو جانا چاہیے تو یہ سوال بہت اہم ہے کہ ہمارا نظامِ تعلیم کیسا ہونا چاہیے۔

پاکستان کی اندرونی حالت پر غور کرنے سے ایک اور دردناک پہلو سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ پاکستان میں نصف درجن سے زیادہ مذہبی جماعتیں ہیں جن میں سے کچھ اب، خوش قسمتی یا بدقسمتی سے سیاست میں قدم رکھ چکی ہیں، ان مذہبی جماعتوں میں اس قدر اختلافات پائے جاتے ہیں کہ جب بھی کبھی مذہبی قسم کی کوئی تحریک شروع کی جاتی ہے تو اس وقت ایک واضح سوال اُبھرتا ہے کہ پاکستان میں کونسا مذہب نافذ کیا جائے، کس جماعت کا مذہب اپنایا جائے۔ جبکہ ہر جماعت اپنے آپ کو مذہب حقہ پر گردانتی ہے، اور دوسروں کو راہِ راست سے دُور۔ ان اختلافات نے بعض سنجیدہ طبقوں — جو مذہب کے ساتھ نہایت مخلص ہیں — کو بھی یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ پاکستان ایک غیر مذہبی ریاست بن جائے تو ان اختلافات اور آئے دن کے جھگڑوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھٹکارا مل سکتا ہے۔ چونکہ نئی نسلیں ہمیشہ نظامِ تعلیم کی پیداوار (PRODUCTION) ہوتی ہیں۔ اس لیے وہ طبقے یہ سوچنے لگے ہیں کہ پاکستان کا نظامِ تعلیم غیر مذہبی ہونا چاہیے۔ اور پھر حال ہی میں سُنّی شیعہ طلبہ کے لیے دینیات کا الگ الگ نصاب رائج کرنے

کے مطالبہ کو جب حکومتِ وقت نے تسلیم کر کے اس کو عملی جامہ پہنانے کی کوششیں شروع کر دیں تو غیر مذہبی طبقوں کو زبان کھولنے اور اپنے نظریات کا پرچار کرنے کا مزید موقع ملا۔

ان کی رائے میں سُنّی شیعہ طلبہ کے لیے دینیات کا الگ الگ نصاب رائج کرنے سے ایک بڑی خرابی یہ پیدا ہوگی کہ جو لوگ آپس میں شیر و شکر ہو کر رہتے ہیں ان کی آئندہ نسلیں ایک دوسرے سے کٹ جائینگی۔ وہ مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں، ذرا تصوّر تو کیجیے کہ ایک گاؤں میں دو ہمسائے بستے ہیں۔ ان کا گھر بھی ساتھ ساتھ ہے اور زمینیں بھی ملحقہ۔ لیکن ان میں سے ایک شیعہ ہیں اور دوسرے سنی۔ جب ان کی آئندہ نسل الگ الگ نصابِ تعلیم کے تحت "زیورِ تعلیم" سے آراستہ ہوگی تو ان میں اتحاد و یگانگت کیسے برقرار رکھی جاسکیگی؟ یقیناً یہ اتحاد مجروح ہوگا اور ملک دو بڑی جماعتوں میں بٹ جائے گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ پاکستان میں غیر مذہبی نظام رائج کیا جائے تاکہ ملک کا اتحاد برقرار رکھا جاسکے۔

ان حالات میں ہم سب کے لیے یہ لمحۂ فکریہ ہے کہ ہم سب سر جوڑ کر بیٹھیں اور اس بات پر غور کریں کہ ہم اپنے ملک کو کن خطوط پر چلانا چاہتے ہیں۔ کیا ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم نے اپنا تشخص اور اپنا نظریہ برقرار رکھنا ہے، یا ہمیں چھوٹے چھوٹے فروعی گروہوں میں بٹ جانا ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی ذی شعور شہری یہ نہیں چاہتا کہ وہ اپنی حیثیت ختم کر دے۔ جس کے نتیجہ میں ہم اس فیصلہ پر پہنچتے ہیں کہ ہم کوئی ایسا نظام مرتب کریں جو نئی نسلوں کو متحد بھی رکھے، ان کے ماضی، ان کی تہذیبی و تمدنی اور سماجی و سیاسی قدروں سے انہیں روشناس بھی کرائے۔ اور ایسا نظام صرف اور صرف اسلامی نظامِ تعلیم ہی ہو سکتا ہے۔

ایسا نظام جس کی بنیادیں توحیدِ خداوندی، عقیدت و محبتِ رسالت، قرآنی تعلیمات، احادیث کے احکام اور سلف صالحین کی طرز پر اُستوار کی گئی ہوں جس کی تعلیمات کی رُو سے ہر مسلمان ایک دوسرے کا بھائی ہو جس میں سماجی عدل و انصاف (SOCIAL JUSTICE) کا دَور دورہ ہو۔ ہر شخص کو بنیادی حقوق کی ضمانت و تحفظ حاصل ہو۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مادّی قدروں کے مقابلے میں روحانی قدروں کو اُبھارا گیا ہو۔ غرضیکہ ایسا نظام جس میں بھائی چارہ، دوستی اور تعلقات مذہب کی بنا پر قائم ہوں، اور مذہب کی وجہ سے ختم بھی۔ ایسا نظام جس میں کالے کو گورے پر اور عربی کو عجمی پر کوئی فوقیت حاصل نہ ہو۔ وہاں بلند مرتبہ وہی ہو جو اللہ کے ہاں شرفِ قبولیت کا درجہ رکھتا ہو۔

جس نظام کا ہم یہ خاکہ پیش کر رہے ہیں وہ یقیناً مذہبی نظام ہے، جسے اسلام کے تعلق سے دینی نظام

کہنا زیادہ موزوں ہے۔ اس کا قیام موجودہ حالات میں کوئی آسان کام نہیں کیونکہ ایسا کرنے کے لیے ایک طرف تو ہمیں دنیا کی بڑی طاقتوں سے ٹکر لینا ہوگی تو دوسری جانب اپنے ملک کے "دانشوروں" سے بھی دُو بدُو ہونا ہوگا۔ تاہم یہ کوئی ایسا کام نہیں کہ اگر انسان کرنا چاہے تو کر نہ سکے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ہم مصمم اور ٹھوس ارادہ کر لیں کہ ہم نے ہر قیمت پر اپنی نئی نسل کو غیر مذہبی رجحانات بچانا اور انہیں مذہب کا شیدائی بنانا ہے۔

برٹرینڈ رسل (BERTRAND RUSSELL) اس عہد کا ایک نامور فلسفی اور ماہر تعلیم گزرا ہے۔ اس نے تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اور سماج و تعلیم کو سامنے رکھ کر اس کے مسائل اور ان کا حل بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسل نے تعلیم میں مذہب کی حیثیت و ضرورت سے بھی بحث کی ہے۔ اور عام مغربی مفکّرین کی طرح وہ بھی بڑے شد و مد سے اس بات کے حامی ہیں کہ مذہب و تعلیم دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اور مذہب کے لیے ضروری نہیں کہ تعلیم کا جزو یا اہم جزو ہو۔ چنانچہ انھوں نے اپنی کتاب "تعلیم اور نظام معاشرہ (EDUCATION & SOCIAL ORDER) میں اس موضوع پر خاص طویل بحث کی ہے۔ اور ایسی تعلیم پر جس میں مذہب جزو یا جزو اعظم کی حیثیت رکھتا ہو، خاصے اعتراضات کیے ہیں۔ ہم ذیل میں ان اعتراضات کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔ اور ان کا جواب دینے کی کوشش کریں گے۔

(۱) مذہبی تعلیم ایک محدود الخیال طاقت ہے۔

(۲) مذہبی تعلیم صرف ان لوگوں کے لیے باعثِ تسکین ہو سکتی ہے جو اس پر ایمان رکھتے ہوں۔

(۳) مذہبی تعلیم کی بنیاد خوف پر رکھی جاتی ہے۔ اس لیے جس حد تک مذہب جذبۂ خوف کو اپیل کرتا ہے اسی حد تک وہ انسانی وقار کو کم کر دیتا ہے۔

(۴) اگر مذہب (روحانی قدروں، مابعد الطبیعاتی اُمور اور حیات بعد الممات) پر غور کرنا شروع کر دیں جو مذہبی تعلیم کا لازمی نتیجہ ہے تو دوسری دنیا کے مقابلے میں یہ دنیا غیر اہم نظر آنے لگے گی۔ اور ہم اس دنیا اور اس کے مسائل سے صرفِ نظر کر لیں گے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس دنیا میں ترقی کی رفتار کم ہو جائے گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ ترقی کا پہیہ جام ہی ہو جائے۔

(۵) مذہبی تعلیم اخلاق پر بُرے اثرات مترتب کرتی ہے اور وہ جذبۂ خود اعتمادی کے سوتوں کو خشک کر دیتی ہے۔

(۶) مذہبی تعلیم ذہنی اوصاف کی قدر و قیمت کا ناکافی اندازہ لگاتی ہے۔

رسل کے مذہبی تعلیم کے خلاف یہ اعتراضات خاصے اہم اور وقیع ہیں، لیکن ان کے متعلق جوابات دیئے جا سکتے ہیں، ہم پہلے مجموعی طور پر ان کا حل پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ اور پھر ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ جواب بھی دیں گے۔

سب سے پہلے بنیادی فرق تو یہ ہے کہ رسل نے ماحول میں رہ کر سوچا ہے۔ وہ عیسائیت کا ماحول ہے جس میں ریاست اور کلیسا دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اور دونوں اپنی اپنی جگہ بہت مضبوط ہیں اور ان میں سے کوئی بھی دوسرے میں ضم نہیں ہونا چاہتا۔ جس کا لازمی نتیجہ ہے کہ وہاں معاشرہ ہر وقت دو گروہوں میں بٹا رہتا ہے۔ پاپائے اعظم کے پیرو ریاستی نظام کو کمتر اور حقیر سمجھتے ہیں جبکہ ریاستی نظام پر کاربند طبقے پاپائے اعظم اور ان کے پیروکاروں کو رجعت پسند اور ترقی کی راہ میں حائل قرار دیتے ہیں۔ رسل نے اپنے مذکورہ بالا اعتراضات میں اس حکومتی طبقہ کی نمائندگی کی ہے۔

اس کے برعکس اسلام ایک ایسا نظامِ حیات رکھتا ہے جس میں ریاست اور مذہب میں کوئی دوئی نہیں نہیں ہے۔ بلکہ اسلام اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک ایسا مذہب ہے جو حکمرانہ مزاج رکھتا ہے۔ اسلامی خلیفہ اگر ایک وقت میں مسجد میں مسلمانوں کی امامت کر رہا ہوتا ہے تو دوسرے لمحہ وہی فوجوں کا سپہ سالار اور ریاست کا ناظم الامور ہوتا ہے۔ اس لیے اسلام میں ایسا کوئی تصور نہیں کہ وہاں مذہب و ریاست کو الگ کر کے کوئی غیر مذہبی نظامِ حکومت عمل میں لایا جا سکے۔ مزید برآں اسلام کے بارے میں رسل صاحب نے خود بھی ایک جگہ لکھا ہے:

"ISLAM IS A STATE RELIGION"

جب وہ خود اسلام کو ریاستی مذہب قرار دیتا ہے، اور ایک دوسری جگہ اس حقیقت کا معترف ہے کہ تعلیم اگر متاثر ہوتی ہے تو وہ صرف جماعتی مذہب سے ہوتی ہے جو تمام قدیم اداروں میں بلکہ بعض ممالک میں تو حکومت پر بھی تسلط جمائے ہوتا ہے۔ مذہب جماعتی اور انفرادی ہوتا ہے اور بقول رسل، جماعتی مذہب حکومت تک پر اپنا تسلط جما لیتا ہے اور اسلام ریاستی مذہب بھی ہے تو لامحالہ وہ ریاست کے تمام امور پر اثر انداز ہوگا۔ اور تعلیم ان امور کا ایک جزو ہوگی۔ لہٰذا اسلامی ممالک میں غیر مذہبی نظامِ تعلیم قابلِ عمل نہیں ہو سکتا۔

ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے بھی اس موضوع پر اظہارِ خیال کیا ہے، اور انہوں نے غیر مذہبی نظامِ تعلیم کے حامیوں سے بنیادی اختلاف یہ کیا ہے کہ ہمارا اور ان کا نصب العین بالکل جداگانہ ہے۔ ان کی رائے میں

مغربی مفکرین چونکہ انسانی فطرت (NATURE) کو سمجھنے سے قاصر ہیں، اس لیے وہ سائنسی اور مادی علوم میں تو کچھ اضافہ کر سکتے ہیں، لیکن انسان اور اجتماعی علوم، جن کی تدوین و تنظیم کا دارومدار فطرتِ انسانی کے صحیح نظریہ پر ہے اور جن میں فلسفۂ تعلیم بھی شامل ہے، ان کی دسترس سے باہر ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے یہ بھی لکھا ہے کہ "مغربی قومیں غیر مذہبی نظریۂ تعلیم کو اپنے مخصوص حالات، اپنی مخصوص تاریخی اور ذہنی کمزوریوں کی بنا پر اپناتے ہوئے ہیں"۔ اس کے برعکس جب ہم اسلامی نظامِ تعلیم کا جائزہ لیتے ہیں، جو وحیِ خداوندی سے اپنے اصول وضع کرتا ہے۔ اور وہ اصول انسانی فطرت اور فطری تقاضوں کے عین مطابق ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ روحانی قدروں کے ساتھ ساتھ مادّی قدروں کو بھی اپنا لیتا ہے۔ اسلام کا چونکہ ماضی بہت شاندار ہے۔ اور وہ اندرونی طور پر بھی ایسے حالات سے دوچار نہیں کہ وہ مذہبی نظام نہ اپنا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان جیسی نظریاتی اور مذہبی ریاست کا تعلیمی نظام مذہبی ہی ہو سکتا ہے۔

ان مجموعی جوابات کے بعد اب ہم سطورِ بالا میں مذکورہ اعتراضات کا الگ الگ جواب دینے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ رسل صاحب کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ مذہبی تعلیم انسان کو محدود الخیال بنا دیتی ہے۔ ہماری رائے میں کوئی بھی ایسا مذہب جو آسمانی ہو اور اپنی صورتِ نزول میں موجود ہو وہ محدود نہیں ہو سکتا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انسانی خیالات غیر محدود اور وسعت پذیر ہیں، اور مذہب فطرتِ انسانی، جو وسعت پذیر ہے، کے مطابق ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ محدود نہیں ہو سکتا۔ پھر اسلام جو اقوامِ عالم بلکہ پوری انسانیت کا مذہب ہے، اس میں محدود الخیالی کو کم ہی دخل ہے۔ اسلام کے مقررہ اصولِ حیات ہیں جن کی وسعت میں حالات و زمانہ کی رعایت کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔

دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ مذہبی تعلیم ان لوگوں کے لیے باعثِ تسکین ہو سکتی ہے جو اس پر ایمان رکھتے ہوں۔ اس وقت بنیادی سوال یہ ہے کہ تعلیم کا مقصد کیا متعین کیا جاتا ہے۔ اگر تعلیم کا مقصد محض تسکین کا حصول ہے تو یہ ایک ایسا غیر مرئی اور خود غرضانہ مقصد ہے جس کے حصول اور عدمِ حصول سے انسانیت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ ہمارے راستے میں تعلیم کا مقصد ایسا ہونا چاہیے جس میں انسان کی روحانی تسکین بھی ہو، انسانیت کی بھلائی بھی اور مادّی ترقی کے راستے بھی مسدود نہ ہوں۔ اسلام میں حقوق اللہ اور ذکر اللہ کا تصور روحانی تسکین، حقوق العباد کا لحاظ انسانی بھلائی اور تسخیرِ کائنات کا حکم مادّی ترقی کی ضمانت ہیں۔

تیسرا نکتہ یہ اٹھایا گیا ہے کہ مذہب میں خوف کا جذبہ داخل ہوتا ہے۔ اس لیے مذہب انسانی وقار کو

کم کر دیتا ہے۔ یہ اپنا اپنا نقطۂ نظر بھی ہو سکتا ہے کہ وقارِ انسان کس چیز سے بلند ہوتا ہے، اور کس امر سے پست۔ جہاں تک خوف کے جذبہ کا تعلق ہے وہ ایک ایسی انفعالی کیفیت ہے جو ہر انسان میں موجود ہوتی ہے۔ اور ہر نظام بلکہ ہر معاشرے کے کچھ ایسے اپنے عوامل ہوتے ہیں جن سے ڈرتے رہنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ آپ چاہے کتنا ہی آزاد اور جمہوری معاشرہ تشکیل کر دیں پھر اس میں قانون کی بالادستی تو ضرور قائم رکھیں گے، ورنہ کوئی نظام قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ جس نظام میں قانون کی بالادستی قائم ہوگی وہاں خوف کا پایا جانا ضروری ہے۔ اس کے برعکس اسلام میں انسان پر حاکمیتِ اعلیٰ صرف خداوند تعالیٰ کی ہوتی ہے۔ اس سے ذرا آگے بڑھیے تو اسلام اپنے سچے پیروکاروں کو خوف سے آزاد کر دیتا ہے۔ چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے: اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔

رسل کا اگلا خیال یہ ہے کہ مذہبی مسائل میں انسان اس دنیا سے قطع تعلقی کر لیتا ہے، جس سے ترقی کی رفتار میں فرق آتا ہے۔ بجا ارشاد ہے، ایسا ان مذاہب کے پیروکاروں کے لیے تو ممکن ہوگا جہاں روحانی اور مادی قدریں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ لیکن ایسے مذاہب میں اس تردّد کی کوئی ضرورت نہیں۔ جہاں انسان دل و زبان سے اپنے پروردگار کی حمد و ثنا کر رہا ہو تو ہاتھوں سے کوئی سائنسی اور فنی تجربہ، مزید برآں اسلام میں گوشہ نشینی یا اس دنیا ــــ جو دارالعمل اور دارالاسباب ہے ــــ سے مُنہ موڑنے کی ضرورت نہیں بلکہ یہاں تو "لا رھبانیۃ فی الاسلام" کا ایک ایسا حیات آفریں اصول موجود ہے جو ہر لمحہ انسان کو دعوت دیتا ہے کہ چاند، سورج، زمین، آسمان اور ان میں چھپے ہوئے تمام خزانے، اے انسان تیرے مطیع ہیں۔ اور یہ تیرا فرض ہے کہ تو ان خزانوں کو دریافت کر کے اپنے تصرّف میں لائے۔

اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو انسان میں خود اعتمادی پیدا کرتا ہے اور اسے دعوت دیتا ہے کہ وہ اپنی عقل و شعور کو بروئے کار لائے اور سوچے، چنانچہ اَفَلَا یَتَفَکَّرُوْنَ، اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ اور وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰہِ مَثْنٰی وَفُرَادٰی، انسان کو بلاتے ہیں کہ وہ غور و فکر کر کے نظریات بنائے اور پھر انہیں تجربات کی کسوٹی پر پرکھ کر کھرا کھوٹا الگ کرے۔ جب کسی انسان کو نامعلوم کام کرنے کی دعوت دی جائے اور وہ اسے بحسن و خوبی پایۂ تکمیل کو پہنچا دے تو اس کی خود اعتمادی کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے! یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی توجہ ان امور کی جانب دلائی، جن سے وہ نا آشنا تھا۔ تاکہ اس میں خود اعتمادی بڑھے اور اس میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا جذبہ جنم لے کر نشو و نما پائے۔

جناب رسل صاحب کا آخری اعتراض یہ ہے کہ مذہبی تعلیم انسانی ذہن کا غلط اندازہ لگاتی ہے اور وہ انسان پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کر دیتی ہے جس سے دو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ انسانی آزادی متاثر ہوتی ہے۔ دوسری یہ کہ انسانی فکر پر تالے ڈال دیئے جاتے ہیں۔ بلاشبہ مذہب ایک ایسا ضابطۂ حیات دیتا ہے جس میں اوامر و نواہی ہوتے ہیں۔ اور اگر اوامر و نواہی ہی آزادی پر قدغن لگاتے ہیں تو ایسی پابندی قبل تاریخ معاشروں سے لیکر آج تک چلی آ رہی ہے۔ قبائلی روایات، رسوم و رواج — جو بعد میں رواجی قانون کا جزو بنے — زمانہ قدیم سے انسان نے اپناتے ہوتے ہیں۔ کیا وہ انسانی آزادی کو سلب نہیں کرتے؟ جس کے مقابلے میں اسلام نے صرف اصولِ حیات متعین کر دیئے ہیں۔ اور ان کی جزئیات کا تعین خود انسان پر چھوڑ دیا ہے، جس سے انسان کو خاص حدود میں رہتے ہوئے غور و فکر کی پوری آزادی حاصل ہوتی ہے۔ اور جب اصولوں کی روشنی میں نئے ضوابط وضع کرنے اور فروعی احکام کو تشکیل دینے کی پوری پوری آزادی ہو تبھی انسانی عقل صحیح معنوں میں کام کر سکتی ہے۔ اگر عقل کی کوئی منزل متعین نہ ہو تو اس کے پاس اصول نہ ہوں تو ہر قدم پر بھٹکتی ہے، اور مقصد یا نصب العین تک پہنچنے سے قاصر رہتی ہے۔ چنانچہ اسلامی نظامِ حیات ان تمام چیزوں کی اجازت دیتا ہے جو اسلامی تعلیم کا لازمی جزو اور کبھی ختم نہ ہونے والا حصّہ ہیں۔

یہاں تک تو ہم نے مغربی مفکر تعلیم کے ان اعتراضات کا جواب دیا جو انہوں نے مذہبی تعلیم کے خلاف عائد کیے تھے۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام جس مذہبی تعلیم کی تلقین کرتا ہے اس میں مذکورہ امور کی گنجائش نہیں ہے۔ بلکہ وہ تو بذاتِ خود ان اعتراضات کا جواب ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ ہم اسے صحیح معنوں میں اپنی زندگیوں میں جاری اور ساری کریں۔

اب ہم ذرا ان لوگوں کے اعتراض کا جائزہ لیتے ہیں جو شیعہ سُنّی طلبہ کے لیے اسلامیات کا الگ الگ نصاب بنانے سے بدک کر غیر مذہبی نظامِ تعلیم اپنانے کے خواب دیکھنے لگے ہیں۔ دراصل دبی زبان میں "اُونگھتے کو ٹھیلنے کا سہارا" کے مصداق یہ لوگ تو پہلے ہی مذہب سے روگرداں تھے۔ اور اس نئی تبدیلی نے انہیں مزید تقویت بخشی۔ جس کے نتیجہ میں یہ لوگ مذہب کے خلاف مزید دریدہ دہنی سے کام لینے لگے۔ اس حد تک تو ہمیں بھی ان سے اتفاق ہے کہ ہمارے ملک میں ایسا نہیں ہونا چاہیے بلکہ ایک ہی ایسا نصاب بنایا جائے جو سب کے لیے قابل قبول ہو تاکہ تعلیم میں یکسانیت پائی جائے، اور ہم زندگی کے ہر میدان میں مذہب و ملّت کے شیدائی پیدا کر سکیں۔ لیکن اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ بالفرض اگر دو نصاب رائج ہو گئے تو ہم تباہ و برباد ہو جائیں گے اور

اپنا الگ وجود قائم نہیں رکھ سکیں گے۔

اس زیرِ بحث مسئلہ کو سمجھنے کے لیے ہم دنیا کے عظیم مذہب عیسائیت کی مثال لیتے ہیں۔ یہ بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ عیسائیت دو فرقوں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ میں بٹی ہوئی ہے۔ اور عیسائی ممالک کی ابتدائی تعلیم پر یہ دونوں گروہ قابض ہیں۔ ان کے ہاں نہ صرف نصابِ تعلیم الگ الگ ہیں، بلکہ کیتھولک تو اس حد تک متعصب ہیں کہ وہ اپنے مخالف گروہ کے ماہرینِ تعلیم تک کو اپنے مدارس میں اساتذہ کی حیثیت سے قبول نہیں کرتے۔ ان سب امور کے باوجود وہ دونوں فرقے اپنی اپنی جگہ زور شور سے کام کر رہے ہیں۔ اپنے تبلیغی ادارے بھی چلا رہے ہیں اور اپنا تشخص قائم رکھنے کے ساتھ روز افزوں ترقی پذیر ہیں۔ اِس لیے ہماری رائے میں ہمیں اُن نصابوں سے بدک کر ہی اتحاد کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ ہم اپنے نظریہ اور تہذیب و ثقافت کی حفاظت کر سکیں۔ مذکورۂ بالا ساری بحث سے ہم مندرجہ ذیل امور و نتائج اخذ کرتے ہیں:

(۱) تعلیم ریاستی نظام کے تابع ہوتی ہے۔

(۲) پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے۔ اس کا نظامِ تعلیم بھی نظریاتی یعنی اسلامی ہوگا۔

(۳) مذہبی تعلیم پر وارد کیے گئے اعتراضات اسلام کے مذہبی نظامِ تعلیم پر عائد نہیں ہوتے۔

(۴) اگر اسلام کا نظام مذہبی تعلیم دو حصوں میں بٹ جاتے تو اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

اب ہم سطورِ ذیل میں اس امر کا مختصر جائزہ پیش کریں گے کہ اسلام کے نظامِ تعلیم میں کیا اس قدر جان موجود ہے کہ وہ دنیا کے دیگر ترقی یافتہ نظامہائے تعلیم کے مقابلہ میں لایا جا سکے۔

مذاہبِ عالم میں غالباً اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے پڑھنے لکھنے کے نظام کو اپنی ابتدا ہی سے اپنایا، اور ناخواندہ اور اپنی ناخواندگی پر فخر کرنے والے عرب معاشرے میں اسے باقاعدہ ادارے کی حیثیت سے نظامِ حکومت کا جزو بنایا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں اصحابِ صُفّہ کے لیے اسلامی جامعہ قائم کی اور حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت تک مدارس و کلیات کا جال سارے اسلامی علاقہ میں پھیل چکا تھا۔ اور نظامِ تعلیم اس حد تک منظم اور فعّال تھا کہ ابتدائی تعلیم لازمی تھی اور اساتذہ کو سرکاری خزانہ سے باقاعدہ تنخواہیں ملا کرتی تھیں۔

اسلام کا نظامِ تعلیم کوئی نظریاتی (IDEAL) امر ہی نہیں ہے بلکہ قابلِ عمل حقیقت بھی ہے جس میں بنیادی چیز یعنی پڑھنے لکھنے کی بہت تلقین کی گئی ہے۔ چنانچہ علم کا حصول ہر مسلمان کے لیے لازمی قرار دے دیا

گیا۔ ارشادِ نبوی ہے "طلبُ العلمِ فریضۃ علی کل مُسلمٍ و مُسلمۃٍ"۔ اس کے ساتھ ہی واضح امرِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے "اطلبوا العلم من المھد الی اللحد" مزید برآں قرآن حکیم میں مسلمانوں کو تعلیم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی کہلوایا ہے "رَبِّ زِدْنِی عِلْمًا۔ نیز عالم کی غیر عالم پر مختلف طریقوں سے فضیلت بیان کی گئی ہے۔

تعلیم کی حوصلہ افزائی کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام نے مقصدِ تعلیم کی جانب بھی پوری توجہ دی ہے۔ یہ مسئلہ چونکہ تعلیم کے لیے بنیادی ہے اور موت و زیست کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے تقریباً ہر نظامِ تعلیم اپنا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور رکھتا ہے۔ اسلامی تعلیم کے مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے سیّد قطب نے لکھا ہے "کہ جاہلیت ایک ایسا ہمہ گیر اور بہت وسیع مفہوم رکھتی ہے، اس کے بہت سے اجزاء اور بہت سی شاخیں ہیں اور اس میں پیچ در پیچ اتنے زیادہ راستے ہیں کہ صراطِ مستقیم کی تلاش ممکن ہی نہیں اس لیے اسلام نے اپنے پیروکاروں کو اس سے بچنے کی تلقین کی ہے۔" تاکہ انسان لاتعداد راہوں اور من گھڑت طرز ہائے زندگی کو چھوڑ کر ایک ایسے نظامِ حیات کی طرف آجائے جو سب کو ایک ہی وحدت میں پرو دیتا ہے۔ اور یہی روحِ توحید ہے۔ اور توحید ہی کو اپنانے سے انسان حقوق اللہ کی بجا آوری کا مستحق ہو سکتا ہے۔ سیّد قطب اپنے اس بیان سے بتانا چاہتے ہیں کہ اسلامی نظامِ تعلیم کا مقصد موحد پیدا کرنا ہے۔

سیّد قطب کے اس ارشاد سے اسلامی تعلیم کے مقصد کا ایک جزو سامنے آتا ہے جبکہ اسلام میں حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کو بھی ضروری گردانا گیا ہے اسلیے اسی تعلیم میں "اَلْمُسْلِمُ من سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِہٖ و یدہٖ" بھی شامل کر کے غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اسلامی تعلیم کا بنیادی مقصد بلند پایہ موحدین اور اچھے شہری پیدا کرنا ہے، جو متے توحید سے سرشار ہو کر جب انصرامِ مملکت سنبھالیں گے تو جور و تعدّی کی بجائے عدل و انصاف، بغض و عداوت کی جگہ اخوت و مساوات، عفو و درگذر اور رواداری کا دَور دورہ ہوگا۔

نصابِ تعلیم کے بارے میں اسلام کے متعلق یہ غلط فہمی عام ہے کہ ابتدائی عہد میں جبکہ اسلام صحیح معنوں میں نافذ العمل تھا۔ اس وقت انسان تہذیبی مراحل کے بہت ابتدائی دَور میں تھا۔ اس لیے اس وقت علوم و فنون بھی محدود تھے۔ اب چونکہ انسان نے کافی ترقی کر لی ہے اور لاتعداد علوم و فنون کا اضافہ ہو چکا ہے اور اسلامی نصابِ تعلیم بہت محدود ہے جو موجودہ علوم و فنون کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

اس تعلق سے یہ کہا جائے گا کہ اسلام ایسا نظامِ حیات نہیں دیتا جس میں اتنی بھی وسعت نہ ہو کہ وہ زمانہ د

حالات کا ساتھ نہ دے سکے۔ دراصل اسلام کے کچھ بنیادی اصول ہیں جن کو زندگی کے ہر شعبہ میں لاگو کرکے وہ باقی امور کو انسانوں کی صوابدید پر چھوڑ دیتا ہے۔ چنانچہ یہی حال تعلیم کا بھی ہے۔ اسلام میں نصابِ تعلیم ترتیب دیتے وقت اس امر کا خیال رکھنا ہوگا کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد مجروح نہ ہوں اور بس۔ اور اس طرح ہر اس علم وفن کو جزوِ نصاب بنایا جاسکے گا جو مذکورہ دونوں امور کے خلاف نہ ہو۔ البتہ معلّم کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ وہ ہر چیز پڑھاتے وقت طالب علم کے ذہن میں یہ بات راسخ کردے کہ ہر چیز کا حقیقی خالق و مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اور انسان اس کا امین ہے۔

نصابِ تعلیم کے بعد اہم سوال استاذ و شاگرد کا پیدا ہوتا ہے۔ اسلام اس تعلق سے کردار سازی پر بہت توجہ دیتا ہے۔ اور وہ اس امر کا خصوصیت سے خیال رکھتا ہے کہ استاذ کردار کا نمونہ اور اخلاق کا پیکر ہو۔ اس کے ساتھ ہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے عمل سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہر شخص ہر مضمون کی تعلیم نہیں دے سکتا۔ بلکہ "الفنّ للرّجال" کے زرّیں اصول پر عمل کیا جاتا ہے۔ اور استاذ صرف وہی مضمون پڑھا سکتا ہے جس میں اُسے مہارتِ تامہ حاصل ہو۔ چنانچہ عام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا کہ "فقہ ابن مسعود اور تفسیر ابن عباس سے سیکھا کرو"۔ آپ نے ان صحابہ معلّمین کی اہلیت کے مطابق انہیں (SUBJECTS) تفویض (ALLOT) فرمائے۔

اس کے ساتھ ہی طالب علم کو یہ تعلیم دی کہ وہ اپنے بڑے یعنی استاذ کی عزت و تکریم کرے۔ ارشادِ نبوی ہے کہ "جو بڑوں کی عزت نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں ہے"۔ دوسری جگہ فرمانِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلّم یوں ہے: "الدّین کلّہ ادب" یہ اور اسی طرح کے اور بہت سے ارشادات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلام استاذ کو اخلاق و کردار کا نمونہ بنانا چاہتا ہے تو شاگرد کو مطیع و فرمانبردار اور منقاد۔ جبکہ یہ ایک ایسا نفسیاتی اصول ہے کہ جسے اپنا کر ہم استاذ و شاگرد کے تعلقات کو نہایت ہی خوشگوار بنا سکتے ہیں۔ اور یہ اچھے تعلقات تعلیمی اور اعلیٰ معیار کے ضامن ہونگے۔

ان امور کی روشنی میں یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ اسلام کا تعلیمی ڈھانچہ نہ صرف مکمّل ہے۔ بلکہ بعض امور خصوصاً اس بارے میں کہ نیکی کرنے سے علم بڑھتا ہے، اور برائی سے کم ہوتا ہے۔ میں دنیا کے دیگر نظامہائے تعلیم سے بہت آگے بڑھا ہوا ہے۔ اور یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اسلام کا نظامِ تعلیم حال و مستقبل میں انسان کی پوری پوری رہنمائی کرسکتا ہے۔

ہماری رائے میں پاکستان جیسی مذہبی اور مذہب کے نظریہ پر قائم ہونے والی ریاست کی یہ اوّلین ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے باشندوں کو اسلامی نظامِ تعلیم دے۔ جب ہم اسلامی نظامِ تعلیم کا پاکستان کے موجودہ نظام و نصاب کی روشنی میں جائزہ لیتے ہیں۔ اور اسلامی نظامِ تعلیم کو موجودہ نظام کی جگہ لانا چاہتے ہیں تو ہمارے ذہن میں اس کے دو پہلو آتے ہیں:

ا۔ ابتدائی درجوں (CLASSES) میں نصابِ تعلیم اسی قسم کا ہو کہ اسلام کے بنیادی اصول اس میں شامل کر دیئے جائیں اور ہر بچہ وہ نصابِ تعلیم پڑھے۔

ب۔ سارا نظامِ تعلیم اس طرح بدلا جائے کہ وہ اسلامی ہو جائے جس میں سائنسی علوم کی بنیاد اسی حکم خداوندی پر ہو کہ "وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ"، اور ٹیکنالوجی کی اساس "وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ" قرار پائے اور اسی طرح دیگر جملہ علوم و فنون مرتب ہوں۔

پاکستانی مسائل اور مخصوص حالات کے پیشِ نظر ہماری رائے میں پہلی تجویز کو اپنا کر اس پر فوری عمل درآمد شروع کر دیا جائے اور حکومت جو اسلامیات کا نیا نصاب ترتیب دے رہی ہے۔ اس میں اس امر کا خصوصی خیال رکھا جائے کہ آٹھویں درجہ تک ہر طالب علم اسلام کے بنیادی احکام سے واقف ہو جائے۔ اور قرآنِ حکیم ناظرہ پڑھ سکے۔ اس کے لیے ایک جانب تو دینیات کی کتب جامع مرتب کی جائیں تو ساتھ ہی ساتھ اردو کی کتب میں اسلامی تمدن و تہذیب کے متعلق اور اخلاق و کردار سازی کے بارے میں وسیع پیمانے پر مضامین شامل کیے جائیں۔

جہاں تک جزو "ب" کا تعلق ہے۔ ہماری تعلیم کی اصل منزل یہی ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس کے لیے ہمیں وقت، مادی وسائل اور اعلیٰ درجہ کے علماء کی ضرورت ہوگی، جن کے حصول میں سردست بہت سی دقتیں ہیں۔ اس لیے ہماری رائے میں ایسا نظام مرتب کرنے کے لیے حکومت کو ایک جامع منصوبہ بنانا چاہیے اور دو یا تین مراحل میں ایسا نظامِ تعلیم مرتب کر دینا چاہیے۔ اس وقت جبکہ تعلیمی اداروں کو قومی تحویل میں لیا جا رہا ہے۔ یہ ایک عمدہ موقع ہے کہ ابھی سے کوئی ایسا منصوبہ تیار کر لیا جائے اور تعلیمی اداروں کو قومیانے کا مرحلہ پورا ہونے تک نصاب و نظامِ تعلیم کو بھی اسلامی طریقے پر ڈھال لیا جائے۔